

# علامہ عبدالعزیز مبین

نور شید رضوی



علامہ عبدالعزیز مبین کا نام پہلی مرتبہ میں نے اپنے استادِ گرامی ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب سے سنا۔ میں اس وقت غالباً ایف اے کا طالب علم تھا۔ ڈاکٹر صوفی صاحب علوم عربیہ کے بجز قارئین۔ ان کی زبان سے کسی کی ایسی توصیف بہت بڑے معنی رکھتی تھی۔ اسی زمانے میں مبین صاحب کو، ڈاکٹر صوفی صاحب ہی کی وساطت سے پہلی مرتبہ دیکھنے کا شرف بھی نصیب ہوا۔ وہ یوں کہ صوفی صاحب نے ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں کراچی کا سفر اختیار فرمایا اور ذرہ مجتہد مجھے بھی اپنے چند ہم سفروں میں شامل کیا۔ کراچی میں ان کی منزلِ مقصود جو مقام تھا اس کا نام شاید معارف اسلامیہ تھا یا اسی سے مشابہ کوئی نام۔\*

یاد آتا ہے کہ ایک روز بھی ڈاکٹر صوفی صاحب کے ہمراہ وہاں گیا اور وہیں پہلی مرتبہ مبین صاحب کی زیارت ہوئی۔ تاہم اس زیارت کو ملاقات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بس دونوں بزرگ بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے تھے اور میں ذرا فاصلے سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی یہ دھندلا سا تصور میرے حافظے کے تصویرِ خلد میں موجود ضرور ہے۔ کتب خانے کی الماریوں کے سامنے مبین صاحب ادھر ادھر آ جا رہے ہیں.... کوئی کتاب لے ڈاکٹر صوفی صاحب سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں.... پاؤں میں غالباً فلیٹ بوٹ ہیں جو بعد کو بھی میں نے انہیں پہنے دیکھا۔

اب میرے ساتھ آٹھ نو سالوں پر سے جسٹ لگاتے ہوئے آگے چلے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایم۔ اے۔

\* یہ مرکزی ادارہ اسلامیات کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی کا ابتدائی ہیولا تھا جو مولانا مبین کے ہاتھوں

تفکیک پارہ تھا (ھیر)

کرنے کے بعد لکچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کئے مجھے ڈھائی برس ہو چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں حالات کے سبب مجھے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے مسلسل پانچ ماہ کی رخصت پر ملازمین زیر علاج رہنا پڑا۔ کچھ عرصہ مکمل طور پر مصاحب فرمائش رہنے کے بعد نومبر کے لگ بھگ میرے معالج نے مجھے صبح وشام ہلکی پھلکی میر و تفریح کا مشورہ دیا۔ اور نیشنل کالج میری ماہرِ علمی تھی۔ میرے لئے اس کے دروبام میں بڑی کشش تھی چنانچہ میں نے گاہ بگاہ واپس جانا شروع کر دیا۔ ایک روز مینار ٹہل (اب شیرانی ہال) کے سامنے والے بکس میں استاد محترم جناب عبدالعقید صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اپنے مخصوص برجستہ انداز میں پوچھا "میں مصاحب سے مل لئے ہو؟ میں نے عرض کیا "نہیں" فرمایا "مل لو، یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ"۔

میں مصاحب ان دنوں پرفیسر حمید احمد خاں مصاحب مرحوم و انس چانسلر جامعہ پنجاب کی مساعی کے نتیجے میں شعبہ عربی اور نیشنل کالج کے صدر تھے۔ صادم مصاحب مجھے ان کے کمرے میں لے گئے اور میرے نہایت اچھے مولانا احمد حسن مجددی اور موسوی کے حوالے سے میرا تعارف کرایا۔ میں مصاحب نے مصافحہ فرمایا اور تملیا کا وہ ایک زمانے میں امر وہہ گئے تھے اور مولانا امر موسوی سے ملے تھے۔ یوں پہلی مرتبہ میں نے عربی زبان و ادب کے اس شہرہ آفاق عالم کو قریب سے دیکھا۔ رنگت گندمی، سینہ چوڑا، سفید ریش، قد درازی، مہکتا نا چہرہ جو پرائی تصویروں میں پُرگوشت ہے، اب استخوانیت کی طرف مائل تھا۔ اونچی دیوار کی ٹوپی پہنے وہ مجھے مرزا غالب سے مشابہ نظر آئے۔

ابھی دنوں ایک روز شام کو اپنے گھر کے قریب پونچھ روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں مرزا غالب لمبا کوٹ اور فلیٹ بوٹ پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے نماں نماں چلے آ رہے ہیں۔ پہلے میں ٹھنک کر غلط فہمی نہ ہو۔ مگر علیک سلیک کے بعد تصدیق ہو گئی۔ لاعلمی میں انہوں نے چھڑی میرے پاؤں پر رکھ دی اور خاصے وزن سے اس پر ٹھک بھی لگا دی اور گفتگو فرماتے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت مجھے عارضین حلقہ کا خیال آیا جس کے بارے میں روایت ہے کہ دربار حیرہ میں معلقہ پیش کرتے ہوئے وہ کمان کی ٹیک لئے تھا اور

کمان کی ٹوک اس کی ہتھیلی کو چیرتی چلی جا رہی تھی مگر اسے کچھ خبر نہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں زد میں میرا پاؤں تھا اور انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ خیر اس سے قبل کہ تکلیف کا احساس پائیں ادب پر حاوی ہو سکتا انہوں نے پہلو بدلا اور میں رہا ہو گیا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ جامعہ پنجاب کی طرف سے مین صاحب کو سمن آبا میں جو کوٹھی رائلش کے لئے لے کر دی گئی تھی وہ میرے مکان سے کوئی ڈیڑھ ہی فرلانگ پر ہوگی۔ مین صاحب کی طبیعت میں سادگی، بے تکلفی اور فاصلہ نہ رکھنے کا جو انداز تھا اس نے حرات دلائی اور ان سے قریب قریب روز ہی ملاقات رہنے لگی۔ صورت یہ تھی کہ شام کا کھانا کھا کر میں ان کے ہاں جا پہنچتا۔ وہ بھی میرے لئے تیار ہوتے مجھے ہمراہ لے کر سڑک پر نکل آتے۔ آدھ بون گھنٹہ چل دئی رہتی جس کے دوران وہ اپنے مخصوص انساٹیبلو پیڈیائی انداز میں مختلف و متنوع موضوعات پر تہایت دلچسپ گفتگو فرماتے رہتے۔ کبھی استنبول اور مراکش کے کتب خانوں کی سیر دکھاتے کبھی ڈاکٹر طلحہ حسین سے اپنی واحد مختصر طاقات کا حال سناتے۔ کبھی ہندوستان کے بعض ہونئی کتبوں کا ذکر کرتے جنہیں بڑی عرق ریزی کے بعد انہوں نے بڑھ ڈالا تھا، کبھی ایک عرب شاعر احمد صافی دردی الخفی (غالباً ہی نام تھا) کا تذکرہ فرماتے جس نے رباعیاتِ خیام کا عربی میں بہت عمدہ منظوم ترجمہ کیا اور کبھی علی گڑھ کی یادیں تازہ کرتے۔ ان کا انداز گفتگو ان کی مجموعی شخصیت کی طرح برجستہ، بے تکلف اور تصنع سے پاک ہوتا تھا۔ جب کسی بات پر زور دینا ہوتا تو چلتے چلتے رک جاتے اور تھوڑی دیر پھرے ہو کر گفتگو کرتے کبھی عربی میں گفتگو شروع ہو جاتی کبھی اردو میں۔ آواز کا اتار چڑھاؤ کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر موضوع کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ عتین ماہ پر پمپلی ہوئی ان صحبتوں کے نقوش آج تقریباً بیس برس کے بعد بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئے اگرچہ اب ایک غبارِ زمانہ کے اور میرے درمیان حائل ہونے لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی وقت ہے کہ اس امانت کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا جائے جس کا حافظہ اور عمر انسان سے کہیں بڑھ کر ہے میری اور ان کی مان

مجتہدوں میں کوئی دوسرا شخص بالعموم حاصل نہیں رہا۔ میرے تمام تر تاثرات خاتی و شخصی نوعیت کے ہیں۔ یہ وہ  
میں صاحب ہیں جو خاص میرے مشاہدے میں آئے۔

میں صاحب کی گفتگو آزاد ستارم خیال کے تحت ہوتی تھی لہذا تو اسے کسی ترتیب میں لانا آسان  
ہے اور نہ تمام باتوں کا احاطہ کرنا۔ بس گھر سے نکلتے ہوئے کسی بھی موضوع کا ایک دھاگہ ان کے ہاتھ آجاتا  
تھا اور وہ راتے مبرائے ادھر بیٹھے بہت تھکا اور واپسی پر دو چار رنگ برنگ گولے میری جیب میں  
ہوتے تھے۔ مثلاً ایک روز میں نے کسی کتاب کے بارے میں کہہ دیا کہ پڑھنے والی کتاب ہے اس پر ان کی طرف  
سے فوراً گھبرائوں جواب آیا۔ ارے، ارے کیا کیا آپ نے! ارے بھی آپ تو امر دہے کے ہیں کیا امر دہے  
میں یہ اردو بولی جاتی تھی؟ بھی پڑھنے والے تو آپ ہیں۔ کتاب پڑھنے والی کیسے ہو سکتی ہے؟ بھی  
پڑھنے کی کتاب کیسے۔ پڑھنے کے لائق کتاب کیسے ... وغیرہ وغیرہ۔

میں صاحب خود دلا جکوٹ کے تھے۔ اردو ان کی زبان نہ تھی لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے پروردگار  
شاگرد تھے اور اہل زبان میں ایک عمر بسر کی تھی۔ ہر چند کہ لہجہ دلی والوں کا تھا مگر اردو سیلف کی بولتے  
تھے۔ تاہم ڈکڑائی کو وہ ہمیشہ ڈکڑائی کہا کرتے تھے اور پت جھڑ کو پت جھاڑ یہ لفظ میں نے اس طرح سنا  
کہ ان دنوں ان کے ایک صاحب زادے۔ غالباً محمد عمر مبین امریکہ گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا میں نے انہوں  
نے دہان کے موسم کا نقشہ بڑے ادبانہ انداز میں کھینچا تھا کہ پت جھڑ کا موسم ہے ہوا چل رہی ہے اور  
دہنوں کے پتے مسلسل گتے ہوئے بڑے بڑے دلکش معلوم ہو رہے ہیں ... وغیرہ وغیرہ میں صاحب  
نے یہ حصہ مجھے سنا کر بے رحم فرمایا کہ دیکھئے یہ صاحب زادے مجھے پت جھاڑ کی کہانیاں سنارہے ہیں  
حالانکہ میں خود پت جھاڑ سے بھی آگے گزر چکا ہوں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے بلند پر مبین صاحب کو فرمایا۔ ڈپٹی صاحب کہہ کر انہیں یاد کرتے۔ ان  
کی عربیت کے بعد معترف تھے۔ فرماتے تھے عربی میں صحیح معنوں میں میرے استاد وہی تھے۔ شاگردوں

میں ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم کا ذکر خاص محبت سے کرتے تھے ( ایک روز میں نے بوجھا کہ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کی جو کہانی لکھی ہے کیا یہ ان کی صحیح تصویر ہے؟ فرمایا بالکل۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کے ہاں جو جرنل سی دکھائی ہے اس کا انہی میں صاحب کی طبیعت میں بھی تھا خیر بیگ صاحب کو تو یہ ہنر مت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکے مگر مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز میرے کونکلتے ہوئے زمین صاحب نے ریاحی تکالیف کے لئے ادراک کا مرتبہ کھایا تو یہ کہہ کر کہ لیجئے آج آپ کو ادراک کا مرتبہ کھلاتے ہیں، مجھے بھی شریک فرمایا یہ درست ہے کہ ستر برس کے بیٹے میں بھی وہ گھر سے یونیورسٹی بس میں آیا جابا کرتے تھے۔ زمین بھی ایک مرتبہ ان کے ہمراہ دو منزلہ بس میں سوار ہوا ( شام کو بیکینی سے انڈر مکن خریدنے بھی خود جلتے اور اندازوں کی چھوٹائی بڑائی پر بحث بھی کر سکتے تھے اور میری ایسے پہلو ان کے ہاں دیکھتے میں آئے کہ نظریہ ظاہر انہیں بخل سے منسوب کیا جاسکتا تھا اور کیا جاتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ دراصل اپنی اپنی ترویجات کا ہے چنانچہ نہ بھولنا چاہئے کہ اواخر عمر میں انہوں نے غالباً ایک لاکھ روپے کا عطیہ جامعہ پنجاب کو دیا کہ اسے عکس کر دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے منافع سے مسلسل عربی کی کتب لائبریری کے لئے خریدی جاتی رہیں، نیز ڈر ڈپٹی صاحب کا تھا۔ ان کے بارے میں بتاتے تھے کہ خود حق پر کیا کرتے تھے مگر کسی اور کو اس حق کی لئے مندر میں لینے کی اجازت نہ تھی۔ آئے جانے والوں کے لئے میز پر چمڑے دھسے رہتے تھے کہ جیسے طلب ہوں ان سے شوق پورا کرے۔

ایک روز عربی زبان و ادب پر ڈپٹی صاحب کی غیر معمولی گزرت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے عزیزوں میں کا ایک لڑکا جو کالج میں پڑھتا تھا، ان کے پاس آیا اور کہا کہ کالج میں امیر کا بیل تشریف لائے ہیں اور اس موقع پر اسے عربی کے کچھ شعر پڑھ کر سنانے کے لئے دس منٹ دیئے گئے ہیں۔ البتہ القابیر کا دیوان ان دنوں داخل نصاب تھا۔ لڑکے نے وہ اشعار منتخب کے بسن کا مطلع ہے:

لَا يَذُوبُ حَبْنٌ بِكَ الْأَمَلُ حَتَّى تَقْصِرَ فِي الْعَمَلِ

لیکن عرض کیا کہ یہ اشعار تو چار پانچ منٹ میں تمام ہو جائیں گے۔ مدعا یہ تھا کہ اسی زمین میں ڈیڑھ صاحب خود کوچہ کہہ دیں تاکہ وہ پورے دس منٹ اسٹیج پر رہنے کی خواہش پوری کر سکے۔ ڈیڑھ صاحب کے کہے ہوئے نو شعر میں صاحب کو یاد تھے۔ میرے دوران مجھے سنا ہے۔ آج میں صاحب سے سنی ہوئی تقریباً سبھی باتیں محض حافظے سے نقل کر رہا ہوں لیکن ڈیڑھ صاحب کا اشعار کو تالیف تصور کرتے ہوئے میں نے اچھی دڑوں نوٹ بھی کر لیا تھا۔ شعریوں ہیں :-

اللَّهُ أَقْدَرُ فِي الْأَزَلِ	أَنْ لَا نَجَاةَ إِلَّا عَسَلُ
النَّصْعُ كَيْسٌ بِتَارِعِ	وَالسَّيْفُ قَدْ سَبَقَ الْعَدْلُ
وَالْمَرْءُ كَيْسٌ بِخَالِدِ	وَالْعَيْشُ أَمْرٌ مُخْتَمَلُ
كُنْ حَيْثُ شِئْتَ مِنَ السُّهُولِ	وَفِي الْبُرُوجِ وَفِي الْقُلَلِ
يَدُ بِلَكَكَ مَوْتٌ فِي الزَّمَانِ	وَلَا يَزِيدُكَ فِي الْأَجَلِ
لَذَاتُ دُنْيَا كُلُّهَا	سَمٌّ وَمَشْوَبٌ بِالْعَسَلِ
الْعُسْرُ فَإِنْ فَالْتَجَا	وَالْمَوْتُ آتٍ فَالْعَجَلِ
حَتَامٌ تَقْلِيدُ الْمَوِيِّ	وَالْإِلَامُ تَجْدِيدُ الْعَيْلِ
أَلْبَسْتَنِي بِعَلَائِقِ الدُّنْيَا حِمَارًا	فِي الْبُوحَلِ

شعر سنا کر میں صاحب نے تبصرہ فرمایا کہ دیکھا! ڈیڑھ صاحب کا کلام ابوالقاسم کا اشعار سے

ایسا یکساں ہے کہ تیز کرنا مشکل ہے۔

کبھی اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات سنانے لگتے تھے۔ ایک دفعہ تو آیا کہ کچھ عرصہ میرا قیام مسجد نیا لگ بند لاہور کے ایک حجرے میں بھی رہا ہے، اسی حجرے کے کہے ہوئے اپنے ایک مدحیہ قصیدے کا ذکر بھی کیا۔ ایک شعر مجھ لوں یا داتا ہے:

كَأَنَّ الْفَاعِلَ الْقَاضِيَ تَنَبَّأَ بِهِ إِذْ قَالَ دَامَ عَلَا الْعِمَادِ

اب یاد نہیں آتا کہ مدروح کون تھا۔ غالباً اس دور کی کوئی متقدر شخصیت تھی۔ بہر حال اتنا تو شعر سے ظاہر ہے کہ نام عماد تھا۔ اس تلمیح کا پس منظر بھی مین صاحب نے خود ہی بیان فرمایا کہ کاتب اصفہانی عماد الدین نے ایک روز القاضی الفاضل عبدالرحیم کو گھوڑے پر سوار دیکھا تو یہ عجیب و غریب جملہ بولا: "سِرُّكَ كَكِبَا يَدِي الْفَرَسُ" جاؤ سدا رو خدا کرے تمہارا گھوڑا الغرش نکھائے۔" ندرت یہ تھی کہ اس پورے جملے کو اگر الٹ دیں تب بھی یہی جملہ باقی رہتا ہے۔ قاضی فاضل نے خدا داد فرست سے فوراً اس نکتے کو بھانپا اور برجستہ جواب دیا: "دَامَ عَلَا الْعِمَادِ" خدا کرے عماد کی بلندی ہمیشہ قائم رہے۔ اس میں ایک طرف عماد اصفہانی کے لقب کی رعایت ہے پھر عماد ستون کو کہتے ہیں چنانچہ اس کی بلندی کی دعا میں ایک معنوی رعایت ہے علاوہ انہی اس جملے کو بھی اگر الٹ دیں تو جوں کا توں رہتا ہے۔

میں صاحب غالب کے مدح تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے فارسی دیوان سے اپنی خصوصی دلچسپی کا ذکر فرمایا۔ تاہم ان کے اپنے ذوق شعر پر مجھے شاعرانہ لطافت سے زیادہ عالمانہ مہارت کا غلبہ محسوس ہوا۔ ان کا انتخاب شعر اکثر و بیشتر لفظی محاسن کے گرد گھومتا نظر آتا تھا۔ عربی کے لائق اور اشعار مع لیں منظر ان کے حافظے میں ہمہ وقت موجود تھے۔ جب کسی مناسبت سے کوئی شعر یاد آ جاتا تو چلتے چلتے رک رک کر اس کی تمہیدیں کوئی پر جوش جملہ بولتے مثلاً "بجئے آج آپ کو دنیا کا بہترین شعر سنائیں یا ایسا شعر آپ کو کہیں نہ ملے گا / کوئی نہ سنائے گا وغیرہ۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا جس کا مقصد صرف آنا ہی ہوتا تھا کہ شعر کے کسی خاص نکتے کی طرف توجہ منعطف کرائی جائے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے شاید دنیا کا بہترین شعر کہہ کر جو شعر سنایا اس میں چہرہ محبوب اور چہرہ ہمتاب کی مماثلت کو ذرا سا بل دے کہ پیش کیا گیا تھا:

بیت اُرْتَبَاهَا..... بین اللُّجُجِ؟ حَتَّى إِذَا غَابَ أَرْتَبِيهِ

ایک مرتبہ ایک بڑی ہی برجستہ و بے ساختہ تعین سنائی جس کا مزاج تک لپٹا ہوں۔ فرمایا کہ اندلس کے شہر لوشہ میں ایک قاضی صاحب تھے جن کی بیوی بڑی ذہین و فطین تھی۔ ایک مرتبہ وراثت کا بچیدہ مسئلہ عدالت میں پیش ہوا۔ قاضی صاحب گھرانے کو سوچ بچار میں غرق تھے۔ بیوی نے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تمہارے سمجھنے سمجھانے کا معاملہ نہیں ہے تاہم بیوی نے اصرار کر کے پوچھ ہی لیا اور پھر ایک معقول حل بھی پیش کر دیا۔ قاضی صاحب حیران ہوئے اور آئندہ کے لئے کرسی عدالت کی پشت پر ایک دریچہ رکھوایا جس میں ان کی بیگ بیٹھ جاتیں اور اکثر مسائل میں قاضی صاحب ان کے مشورے سے مستفید ہوتے رہتے۔ ایک روز ایک شاعر کا مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو یہ شعر کہہ ڈالے۔

بَلْوَشْكَةٍ قَاضٍ لَّهُ ذَوْجَةٌ وَأَحْكَامُهُ فِي الْوَرَى جَارِيَةٌ  
فِي أَيْتِكَ لَمْ يَكُنْ قَاضِيًا وَيَا لَيْتَهَا كَانَتْ الْقَاضِيَةَ

آخری مصرع میں آیت قرآنی کو جس بے ساختگی سے اقتباس کیا گیا ہے محض خدا کو دین ہے ایک روز اندلس کے شہر مالقہ کے ایک شاعر کے یہ شعر سنئے :

مَا لَقَّةٌ حَيِيَّتَ يَا تَيْبَهَا أَلْفُلُكُ مِنْ أَمْلِكُ يَا تَيْبَهَا  
نَهَى طَيْبِي عَنْكَ فِي عِلَّةٍ يَا طَيْبِي عَنْ حَيَاتِي نَسَلِي

ہر تالیف میں یا تیبہما کے الفاظ نئی وضع اور نئے مفہوم میں آئے ہیں جو ایک یا دو کا اتفاق ہے ایک روز یہ ذکر فرمایا کہ عربی میں قال صرف کہنے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اشارہ کرنے کا مفہوم بھی ادا کرتا ہے اور اس ضمن میں یہ نادر اور دلچسپ شعر سنائے



مَرَدَتْ بِعَطَّارٍ وَيَدُ قِيٍّ قَرْنِفَلًا  
 وَمِسْكَآءَ كَأَقْوَرًا فَقُلْتُ لَهُ.....  
 فَقَالَ لِي الْعَطَّارُ رَدَّ قَرْنِفَلِي  
 وَرَمْكِي وَكَأَقْوَرِي فَقُلْتُ لَهُ.....

دونوں شعروں کے مصرع ثانی میں جہاں میں نے نقطے لگا دیئے ہیں وزن شعر کا اعتبار سے وہاں کم از کم ایک سبب نحیف درجہ ایک ذمہ مجموع بروزن عُلُن کی کمی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے بھی دونوں جگہ بات اور صوری ہے یعنی میں لکھ عطار کے پاس سے گزرا جو لونگ، مشک، اور کا فود کوٹ رہا تھا سو میں نے اس سے کہا.... اس پر عطار نے مجھ سے کہا کہ میری لونگ، مشک اور کا فود واپس کر دو سو میں نے اس سے کہا....

دونوں جگہ معلوم نہیں کہ کیا کہا۔ مبین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ دونوں جگہ "قلت" سے مراد اشارہ کرنا ہے نہ کہ کہنا۔ انہوں نے اس اشارے کی عملی توضیح یوں فرمائی کہ پہلا شعر پڑھ کر آخر میں ہانک کے راستے سانس زور سے اندر رکھنا اور سانس کے سر سے وزن شعر کو پورا کر دیا یعنی میں نے عطار کو لونگ، مشک اور کا فود کی خوشبو سونگنے کا یوں اشارہ کیا۔ دوسرے شعر میں مبین صاحب نے سانس زور سے پڑھ کر سانس کو باہر نکالنے سے وزن شعر کو ہوا کر دیا یعنی جب عطار نے وارٹا چایا کہ میری خوشبو میں واپس کر دو تو میں نے کہا یہ تو۔

مبین صاحب کے بے ساختہ پن اور مخصوص طرز بیان میں بعض اوقات معمولی سی باتیں بھی بہت مزاحمتی تھیں۔ میں اب تک سوچتا ہوں تو خیال ہی خیال میں لطف اٹھاتا رہتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تو میں وہ فضا اور وہ انداز منتقل نہیں ہو سکتا۔ ایک روز شام کو ان کے ہاں پہنچا تو میرے لئے نکلنے سے پہلے انہوں نے باہتمام ریڈیو کھولا اور بہت کان دھر کر سننے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ہم دونوں پر سکوت طاری رہا پھر

خیر طرف دیکھ کر بچتہ فرمایا ذرا ہی دیر میں آپ چڑھنے کے مرتے کی خبر سنیں گے۔ مجھے خبر ہی سننے اور اخبار پڑھنے سے کہیں دلچسپی نہیں رہی لہذا مجھے کبیرے خبر پا کر انہوں نے مزید کیا آپ کو معلوم نہیں کئی نقد سے بے ہوش ٹپا ہے۔ پھر انہوں نے خوب لان لگا کر اس خبر کا انتظار کیا مگر جہاں تک مجھے یاد ہے چڑھنے اُس روز نہ مر سکا۔

میں صاحب لیا اوقات شعر کو ایک مخصوص ترنم میں سنایا کرتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ابن الرومی کا ذکر ادا انہوں نے بتایا کہ مرض الموت میں جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ طبیعوں کی رائے میں پیشاب رُک جانے اور اس کے نتیجے میں موت واقع ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے تو اس نے خود کہا۔ (یہ شعر غالباً سر لٹا ہے جیسے چلتے چلتے رُک کر کہ میں صاحب نے اپنے مخصوص لحن میں پڑھا جس کا آثار پڑھا ڈا اب تک کانوں میں گونج رہا ہے۔)

خَدَّائِي تَقَطِّعُ الْبِقُولَ  
وَيَأْتِي الْمَوْتَ وَالْهَوْلَ

گھٹو کا رخ صرف و بخوار زبان و بیان کی طرف مڑھاتا تو بڑھتے کی باتیں روا روئی میں سنا دالتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ افعال ثلاثی مجرد کو ضبط کرنے کے لئے میں نے مکمل غمناک و الصالح کو باقاعدہ خاطر نشیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے کھلنے کے بعد مجھے بے ہوش ہو کر پڑھنے کی عادت ہے۔ قیلے کی اس نیم خوابی کے وقفے میں حق کے علاوہ غمناک و الصالح پاس رکھتا تھا۔ مدقوں اس کی ورق گردانی کرتے کرتے آخر افعال ثلاثی مجرد کے لغات کو بڑی حد تک تسخیر کر لیا۔

ایک روز میرے بعد ان "الجاء قبل الدار" میں الجاء کو زور دے کر بفتح السوا پڑھا اور پھر دہرایا کہ الجاء "الجار"۔ بعنم السوا۔ سمجھنا یہ مطلوب تھا کہ الجاء سے قبل کوئی فعل امر مقدر مانا جائے گا جس کا یہ معنول ہوگا لہذا حالت نصیبی میں ہوگا۔

ابھی دنوں "الروض الألف" مع متن سیرت ابن ہشام میرے زیر مطالعہ تھی۔ ایک جگہ ذکر آیا

کہ جس زمانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو الیوب انصاریؓ کے ہاں قیام فرماتے تھے ایک روز کھانے میں پیاز یا لہسن کی آمیزش ہو گئی۔ آپ نے یہ کھانا کھا لیا اور ڈالے بغیر واپس کر دیا۔ حضرت ابو الیوب کے دریافت کرنے پر آپ نے انہیں تو کھا لینے کی اجازت دی لیکن خود اپنے بارے میں فرمایا "انا رحل انا جی"۔ یہ لفظ "انا جی" میری سمجھ میں نہ آیا۔ اسی شام مین صاحب کے پاس پہنچا تو ان سے ذکر کیا۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہ تھی۔ زبانی ہی لفظ کہہ تجھے اور سیاق و سباق بیان کیا مگر ڈالے سے توقف کے بعد فرمایا "جی" یہ ہے "انا جی" بھینٹہ بھول یعنی مجھ سے سرگوشی کی جاتی ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ مطلب فی الفور آگئے ہو گیا یعنی مجھ سے تو فرشتے ہم کلام ہوتے ہیں اور یہ بولان کو ناگوار کرتی ہے۔ ایسے مواقع پر مین صاحب خود اپنی ستائش میں بھی دو چار لفظ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ یہ ان کا حق تھا۔ بقول غالب :

لائیٰ مدح در زمانہ چون نیست

نویشتن را بھی سپاس کتم

اس روز اسی کیفیت میں اپنے مخصوص اسلوب بیان میں کچھ یوں ارشاد ہوا۔ آج آپ کو روٹی پڑی پر ایسا آدمی نہ ملے گا جو یوں عبارت دیکھے بغیر آپ کا یہ مسئلہ سلجھا دے "الروض الاذنی" کے نام سے یاد آگیا کہ وہ اس کتاب کے ٹپے مدارح تھے ایک روز اپنے خاص ستائشی اسلوب میں فرمایا "جی" سیرت کے باب میں یہ آسمانی کتاب ہے اور نحو کے باب میں یہ سیبویہ کی کتاب آسمانی ہے۔

زبان کے عوامی روزمرہ کے سلیسے میں ایک روز علمائے حریت میں سے کسی کا لطف سنایا۔ (نام مجھ ماہر نہیں رہا) کہ صرف دو خوب حالانہ درس دینے کے بعد جب گھر لوٹے تھکی کی نفسان میں بیٹھ تو ملازم کو داد دے کہچہ اس قسم کی بات کہی کہ فلاں کسبزی مع جڑوں کے لاؤ۔ انہوں نے اس مطلب کے

کے لیے جو لفظ استعمال کئے وہ عامیہ ہیں تھے۔ **بِعُرْوِ قَوْ**۔ اس پر ایک شاعر نے جو ابھی کے علم و فضل سے اکتساب کے کیے بیٹھا تھا عرض کیا۔ **يَا سَيِّدِي هَلَّا قَلَّتْ بِعُرْوِ قَيْهِ**، استاد محترم آپ اس کے بجائے **بِعُرْوِ قَيْهِ** فرماتے تو مناسب تر ہوتا اس پر بھڑک اُٹھے اور چلا کر کہا: **يَا غُلَامُ اَلْمَشْتَبِي بِعُرْوِ قَوْ لَاحِ بِعُرْوِ قَيْهِ** لڑکے وہی عرو و قلاؤنہ کہ عرو و قیہ۔

ایک روز کچھ گفتگو معلقہ امر و القیس کے آخری اشعار خصوصاً اس شعر کے حوالے سے ہوئی: **كَانَ مَلَكًا كَرِيحًا وَرَبِّ عُنْدَيْهِ صِيحُونُ سَلَفًا فَاَمِنْ رَحِيحٍ مُّغْفَلٍ** مگر اب یہ یاد نہیں آتا کہ موضوع گفتگو کیا تھا۔ شاید اعراب کی کچھ بحث تھی۔ یا شاید میں نے غیر کسی مناسبت سے پڑھا تھا۔ ایک جملہ جو غالباً اسی گفتگو سے متعلق تھا آج ایک خوشگوار یاد دہن کر ذہن میں گونج رہا ہے۔ میں صاحب نے فرمایا تھا آپ کے اعراب غنیمت ہیں۔ ایک روز داد اس کی دلچسپ داد بھی یا کیا نہ رہی ہے۔ سمر راہ چلتے چلتے رک کر فرلٹنے لگے مجھی آپ میں اعرابی ادب پڑھنے کی صلاحیت تو تھی لیکن۔ (میر سے پاؤں تک میری جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) اس صحت کے ساتھ آپ کیا خاک عربی ادب پڑھیں گے۔ ان کا اشارہ ان دنوں میری مخدوش صحت اور عربی ادب کی صبر آزما وسعت کی طرف تھا۔ غالباً اس موقع پر اپنی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ میری صحت تو جوانی میں بڑی مضبوط تھی چنانچہ بڑی جانگاہ محنت کر سکا۔

عربی زبان و ادب سے میرے گہرے شغف کی بنا پر وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے گا کہ خود ٹیپلے ہوئے غریب خانے پر چلے آتے۔ امالی لائن درید کی ایک مائیکروفلم ان کے پاس تھی۔ میں نے دل چسپی کا اظہار کیا تو بے جھجک میرے حوالے کر دی۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی احتیاط کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں نے خودوں کے ٹیپے میں متحدہ عدسہ لگا کر پود میکرٹنٹے کا جو طریقہ چین میں سیکھا تھا اس کو آزمایا اور ایک چھٹا سا ریڈر بنا کر اس مائیکروفلم کو ٹیپے کی کوشش کی جس میں صاحب خود بھی

تشریف لائے اور میری اس بچکانہ سی کوشش میں پوری دلچسپی لیتے ہوئے فرمایا جی معلوم ہو گیا کہ آپ اگر کوشش کریں تو ایک چھوٹا سا ریڈر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس نام نہاد ریڈر یا پروجیکٹر کی تاریخ کھلی یعنی شوہ کے بغیر نہیں۔ ہمارے گھر کا ملازم اکرم جو بڑا طرار لڑکا تھا دونوں تاریخ ہاتھ میں تھا کہ کھڑا تھا جب کہا جاتا تو وہ دونوں تاریخ بجلی کے سوراخوں میں داخل کر کے پروجیکٹر کو روشن کرتا۔ یمن صاحب اس کی چابکدستی اور بے خونئی سے بہت متاثر ہوئے اور کچھ لیں تھمرہ فرمایا بھی یہ آپ کا ملازم تو تابلط مشرہ ہے تابلط مشرہ موت کو کچھ دے کر نکلتا ہے پھر تابلط مشرہ کے ان اشعار کا حوالہ دے کر وضاحت فرماتے رہے۔

فَخَالَطَ سَهْلَ الْأَرْضِ لَمْ يَكِدْ حِ الصَّفَا  
بِمَ كَذْحَةَ وَالْمَوْتُ خَزَائِنُ يَنْظُرُ  
فَأَبْتُ إِلَى فَنَهُمْ وَلَمْ آكُ أَيْبًا  
وَكَمْ مِثْلَهَا فَأَرْقَتْهَا وَهِيَ تَضْفِرُ

اس روز پروجیکٹر سے جو عبارت دیوار پر روشن ہوئی اس میں ایک راوی کے نام کو میں نے الثوری پڑھا۔ یمن صاحب وسعت مطالعہ اور استحضار میں بلا کے آدمی تھے فوراً اصلاح فرمائی کہ یہ الثوری نہیں التوزی ہو گا۔ انہوں نے مطالعہ پر کسی جاں کاہ محنت کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو گا کہ ایک روز انہوں نے شفقت انہوں نے میرے حافظے کی تعریف فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ حافظہ تو دراصل آپ کا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کو اس قدر ادبی سرمایہ تو کب زبان ہے۔ فرمایا نہیں آپ ایک بار سن کر یاد رکھتے ہیں جبکہ میں نے یہ سب کچھ سو سو مرتبہ نظر سے گزارا ہے مجھے ان کی شفقت کا ایک اور واقعہ بھی یاد رہے گا۔ ایک روز شام کو معمول کے مطالعہ پہنچا تو کوٹھی کے ایک چھوٹے سے بغل کمرے میں ایٹے حقہ پی رہے تھے۔ کہنے لگے بھی اچھا ہوا آپ آگے آپ سے

ایک فروری بات کرنا تھی۔ ہمارے ہاں شعبہ عربی میں ایک لیکچرار کی اسامی خالی ہے۔ اس کے لئے کئی امیدوار ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی مناسب آدمی مل گیا ہے میں نے کہا ایک آدمی نظر میں تو ہے مگر مشکل ہے کہ وہ امیدوار نہیں ہے۔ انہوں نے کہا آپ اس کی پرواز کریں اگر وہ تھامند ہو تو کوئی ذمہ کوئی صورت نکالی جاسکتی ہے۔ تو بھی میرا اشارہ آپ کی طرف تھا۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ یونیورسٹی میں آنا پسند کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ سب سے پہلے تو آپ کے اسی حسن ظن پر میرا پاس پاس ہوں جو میرے لئے بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم دو ایک باتیں میرے لئے باعث تردد ہیں۔ ایک تو میں سرکاری ملازمت میں ہوں وہ چھوڑنی پڑے گی۔ فرمایا اس کی فکر نہ کریں جو کچھ فوائد اس کے اب تک ہوئے ہیں وہ آپ کی تنخواہ میں شامل ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا دوسری بات ذرا نازک ہے۔ ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کی فضا میں بالعموم سیاست کاری اور جوڑ توڑ کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اور میری طبیعت کو اس سے مناسبت نہیں۔ یہ سنتے ہی لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور دو ٹوک انداز میں فرمایا یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ آپ کے لیے کاروبار نہیں۔ مجھ ستر برس کے بوڑھے کا گزارہ یہاں دشوار ہے۔ مہلّا آپ کس کھیت کی ہولی ہیں نا بھی آپ وہیں ٹھیک ہیں۔“

ہمارا ملازم اکرم جی کا اوپر ذکر ہوا آزاد کشمیر کا تھا۔ نہایت ذہین اور بلا کا پھرتلا۔ میں صاحب اس کے بڑے متداع تھے۔ حالانکہ ہم اس کی ضرورت سے زیادہ بھرتی پر بسا اوقات تنگ آجاتے تھے۔ دوا کا وقت ہو جاتا تو وہ فوراً جہاں کہیں میں بیٹھا ہوتا پہنچ جاتا اور دوا کی گولی خود پانے ہاتھ سے سیدھی میرے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس پیش کرتا۔ ایک روز میں صاحب غریب خان نے پر تشریف فرما تھے کہ ان کی موجودگی میں اس نے یہی حرکت کی۔ میں تو شاید کچھ خفیف ہی ہوا ہوں گا مگر وہ اس کے حق میں طلب اللسان تھے ارے جی کیسا ملازم ہے آپ کے پاس کس قدر راحت

ہے آپ کو۔ ایک وہ ہمالا ملازم ہے بدصوبے ترا بدصوبہ۔ (ان کے ہاں بھی آزاد کشمیری کا ایک ملازم تھا) دیر تک وہ اپنے ستائشی کلمات دہراتے رہے۔

کبھی امور صحت پر گفتگو چڑھاتی تو بہت سی تجربے کی باتیں سناتے۔ سیر کے فوائد کے بڑے قائل تھے۔ ایک زمانے میں انہیں کچھ سوراخوں کے باعث سیر کی ازمدیا بندی کرنا پڑی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں فرجیوں کی طرح مارنا کرتا تھا حتیٰ کہ کڑوٹنے لگتی تھی مگر مگر یہ چمکاکس کے چلتا ہی چلا جاتا تھا۔ اب اگر میرے بڑے ہاں ملے آپ دیکھتے ہیں کہ شام کے کھانے کے بعد اپنے آپ کو اب بھی گھٹیا ہوں۔ ڈاکٹر اگھن کے سخت خلاف تھے۔ وہ اسے ڈال کے بجائے حالی سے والدرا لیتے تھے اور اسے مہلک سمجھتے تھے۔ ان کا یہ جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ والد موت ہے موت ایک موقع پر۔ یاد نہیں، مہر یا کسی اور ملک میں ایک چشمے کے صحت بخش پانی کا ذکر بھی تعریف سے کیا۔ اپنے خصوصی انداز میں بے ساختہ فرمایا۔ مجھے اس چشمے کا پانی کیا پینا تھا میں تو تھوڑے ہی عرصے میں مچھل کر ایسا ہو گیا جیسے جھینسا ہوتا ہے جھینسا۔

علی گڑھ کا ذکر چھڑ گیا تو معروف مستشرق پروفیسر کوکو کے علمی استغراق کے واقعات سناتے اور تعریف کرتے رہے۔ فرماتے تھے کہ اس شخص کو پنا اور اپنے گرد پیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ فلاں سفر میں جریہ نے کس درخت کے نیچے پیش کیا تھا تو اسے یاد ہو گا کہنے لگے کہ ایک روز ڈنر تھا۔ موسم سخت سردی کا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کوکو دروازے سے داخل ہوئے اور حاضرین پر نظر دوڑائی۔ مجھے دیکھا تو سیدھے وہیں چلے آئے اور فی الفور علمی ادب پر گفتگو شروع کر دی۔ کھانا ختم ہو گیا۔ لوگ اٹھ گئے مگر پروفیسر صاحب کو اپنی باتوں میں کچھ خبر نہ ہوئی۔ بالآخر میری تحریک پر اٹھے اور باہر آئے۔ یہاں سخت سردی کے باوجود کھلے آسمان تلے کھڑے ہو کر پھر گفتگو شروع کر دی۔ اتنے میں ملازم اندر سے ایک اوور کوٹ لے کر آیا کہ کسی کا پٹا وہ لگایا ہے۔ پروفیسر کوکو نے اس طرف مطلق توجہ نہ دی مگر میں سمجھ گیا کہ ہونہ ہونہ کوٹ اپنی کا ہے۔ چنانچہ ان سے کہا کہ فور فرمائیے کہیں یہ کوٹ آپ کا تو نہیں؟ اس پر ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی مگر بچان نہ سکے۔ پھر کچھ سوچ کر فرمایا

ہاں یہ میرا ہو سکتا ہے کیونکہ آج سردی خاصی ہے اور سردی بیوی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ لیکن نہیں کہ اس موسم میں اس نے مجھے اور درکٹ کے بغیر آنے دیا ہو۔ اسی اثنا میں ملازم ایک ٹیلیٹ بیٹ بھی اٹھا لایا۔ اسے بھی پروفیسر کو کونے سے استدلال پر قبول کیا۔

میں صاحب بتاتے تھے کہ کونو کی بیوی واقعی ان کا یہ حد خیال رکھتی تھی۔ مگر میوں کی چھٹیوں میں ہم اور صاحب دونوں غالباً ٹیکے کی سیر کر چلے گئے۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آئی تو پروفیسر صاحب فوراً علیگڑھ واپس آئے اور وہاں تدریس کا آغاز کرنے کے لیے بیٹا بھگتے بھگتے گری کا شدت کے پیش نظر چندے اور تھام کرنا چاہتی تھیں پروفیسر صاحب نے کہا کہ ٹیک ہے میں چھٹیاں تو تم کچھ دن بعد چلی آنا۔ بیگم نے کہا مجھے فکر ہے تم سفر میں اپنا سامان بھی سنبھال سکو گے یا نہیں۔ اسی پروفیسر صاحب نے اسے اطمینان دلایا۔ مگر وہ انہیں خوب جانتی تھی۔ خود گاڑی میں سوار کر کے آئی۔ سیٹ ریزرو کرادی۔ کپڑے غسل خانے میں لٹکا دیئے اور بار بار کہا کہ دیکھو اسی سیٹنگ سوٹ میں آ کر نہ چلے جانا۔ جب علیگڑھ نزدیک آئے تو کپڑے بدل لینا۔ سامان بار بار دکھایا کہ یہ دکھائے بھول نہ جانا۔ پروفیسر صاحب ہر بار اسی کی تاکید کا جواب دے لے کر دیتے رہے کہ تو تم قطعاً فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا۔ الغرض وہ غریب رخصت ہوئی اور پروفیسر صاحب غالباً طلبہ سے اپنی ملاقات اور اپنے بچے کے موضوعات میں مستغرق جب علیگڑھ پہنچے تو اسی شب خرابی کے لباس میں میلبوس، بیک بینی درد گوش سیدھے گھوک پلٹے چلے گئے۔ تو کچھ صاحب کی مالپی کے انتظار میں کونو کی لان وغیرہ درست کر رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بیگم ہمراہ نہیں اور صاحب سیٹنگ سوٹ پہنے چلے آ رہے ہیں تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ جو اس ناچکی سے واقف تھے۔ لپک کر پوچھا صاحب، سامان کہاں ہے؟ فرمایا ادھر، ٹرین میں انہوں نے عرض کیا صاحب ٹرین تو ہاپی جی ہوگی کہا تو کیا ان لوگوں نے سامان نہیں اتا لیا ہوگا؟

ایک دفعہ پروفیسر مارگو لیتھ کے آمد کا حال بھی سنایا۔ ایک لطفہ مجھے اب تک یاد آتا ہے۔ میں صاحب نے مارگو لیتھ کے عمری بولنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے کسی چلے کو سن کر مارگو لیتھ نے ایک عجیب سی آواز نکالی



پھر اس کی نقل میں خود آواز نکال کر دکھائی جو سانپ کی چھینکار سے مشابہ تھی اور نا قابل فہم۔ اس آواز کو تحریر میں لانا دشوار ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ داد دیجئے مگر میں سمجھ گیا کہ یہ کہتا ہے مُسْتَعْسِکُن یعنی بہت خوب۔

میں صحت یاب ہو کر واپس سرگودھا آیا تو زمین صاحب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میری نالائقی کو مراسلت کا خیال آیا ورنہ انہوں نے مجھے فراموش نہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ لیں کہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ڈیپارٹمنٹ پرنسپل اور محترم صاحب ایک زمانے میں زمین صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور میں ایک روز بس میں اُن سے ملاقات ہو گئی تو سرگودھا کا نام سن کر اس عاجز کو بھی یاد فرمایا۔ صدر محمد ایوب خان صاحب نے ان کو *PRIDE OF PERFORMANCE* کا اعزاز عطا کیا تو پاکستان ٹائمز میں ان کی تصویر دیکھی اور آیا تم گزشتہ کا خیال کرتا رہا۔ غالباً زمین صاحب اُس وقت تک کراچی مراجعت فرما چکے تھے۔ خدا مہلا کرے پاکستان ٹی۔ وی والوں کا آخری مرتبہ ان کی وساطت سے زمین صاحب کی چلتی پھرتی تصویریں جس میں ان کے شب و روز کے معمولات کا احاطہ کیا گیا تھا دیکھی اور ان کی مانوس آواز میں ان کی کچھ آپ بیتی سنی۔ افسوس کہ اس وقت سنی جب حقیقت میں وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔

## حوالہ جات

- ۱۔ شاید امیر حبیب اللہ خان جن کی دلی میں آمد کا ذکر حضرت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی میں کیا ہے۔
- ۲۔ ابوالعناہیہ کے دیوان میں اس نظم کے اکیس اشعار موجود ہیں۔
- ۳۔ یہ واقعہ بعد کو میں نے وفيات الامعیان میں بھی عماد اصقبانی کے حالات کے تحت دیکھا۔
- ۴۔ یہ مصرع اچھی طرح یاد نہیں آتا۔
- ۵۔ القرآن، ۶۹: ۲۷

۶۔ بعد کو سفر نامہ ابن بطوطہ سے معلوم ہوا کہ یہ اشعار خطیب عبدالوہاب بن علی مالتی کے ہیں اور قاضی

ابو عبداللہ بن عبدالملک نے اسی زمین میں یہ شعر کہہ کر ایک قافیہ نکالا ہے۔

وَحِمْنُ لَا تَنْسَى لَهَا تَيْبَتُهَا

وَإِذْ كُنْتُمْ مَعَ التَّيْبِ زِيَارَتَيْبَتُهَا

